# انتخاب

# مضامین سرسیّد

یعنی

عالیجناب آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خاں مرحوم

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل۔ ایل۔ ڈی۔

بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ

کے

خاص خاص مضامین کا نادر مجموعہ

مع

مختصر حیات و سیرت ——— از پروفیسر آل احمد سرور

تنقید و تبصرہ ——— از شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

تشریحات ——— وغیرہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

قیمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳/۵۰
تعداد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰۰
سنہ اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷۶ء



مطبع : اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت : ریاض احمد، الہ آباد

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں

# فہرست مضامین

# حیات و سیرت

## از پروفیسر آل احمد سرور

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ نہایت معزز اور شریف خاندان سے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے شاہ جہاں بادشاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان تشریف لائے اور شاہانِ دہلی کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ان کے والد میر متقی نہایت قانع بزرگ اور ان کی والدہ نہایت خوش سلیقہ، تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ تربیت اولاد میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کے بعد ابتدائی عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ۲۲ سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد کمشنری آگرہ کے نائب منشی مقرر ہوئے۔ ۲۴؍دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف ہوئے اور وہاں سے بدل کر فتحپور سیکری اور اس کے بعد دہلی آئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں مستقل صدر الصدور بنا کر بجنور بھیجے گئے۔ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کی سب ججی پر ممتاز ہوئے اور غازی پور، علی گڑھ، بنارس سب ججی کی خدمات

انجام دینے کے لئے بھیجے گئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۶ء کو گورنمنٹ انگریزی سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ہوا۔ ۲ر اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے اور ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۷۶ء میں نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ آپ نے پنشن لی اور اپنے آپ کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔

۲۴ر مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کو احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا اور ۲۸ر مارچ کو اکیاسی برس کی عمر میں بمقام علی گڑھ رحلت فرمائی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کالج کی مسجد کے بیرونی حصہ میں دفن ہوئے۔

سرسید کی متعدد تصانیف ہیں جن کا موضوع تواریخ، دینیات اور اخلاقیات وغیرہ ہیں۔ ان میں چند آثار الصنادید، جلاء القلوب، تحفۂ حسن، فوائد الافکار، قول متین، کلمۃ الحق، راہ سنّت وغیرہ ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی کی جو صرف نصف ہو سکی۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے علمی اور فلسفیانہ مضامین رسالہ تہذیب الاخلاق کے لئے لکھے تھے۔

سرسید ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک زبردست مصنف، بلند خیال مفکر، جلیل القدر مصلح اور ہوشیار مدبر تھے۔ ان میں ایک ایسی کشش تھی جو دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا لیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رفقائے کار میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب اعظم یار جنگ، شمس العلماء مولانا حالیؔ، شمس العلماء مولانا شبلیؔ، شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ جیسی قابل قدر ہستیاں شامل تھیں۔ غرض کہ

سرسید کو ایک نظامِ شمسی تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کے گرد یہ ستارے حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان میں سے ہر فرد بذاتِ خود ایک الگ نظامِ شمسی کا مالک تھا۔

**سرسیّد کے مضامین کی بعض خصوصیات** —— سرسیّد کے مضامین میں کسی قسم کی لفاظی اور عبارت آرائی نہیں۔ انھوں نے خاص طور پر اس طرزِ تحریر کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فارسی نثاروں کی تقلید میں اختیار کیا گیا تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ کو تحریر میں دخل نہیں دیتے تھے اور بعض جگہ تو قواعد زبان اور اصول انشا پردازی سے بھی بے پروا ہو جاتے تھے۔ ان کے طرزِ تحریر میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ایک خاص قسم کا زور ہے۔ یہ زورِ بیان دراصل اس "مقصد" کا ممنون احسان ہے جس کا پرچار سرسید زندگی بھر کرتے رہے۔ وہ آزادیِ رائے اور حریتِ فکر کے زبردست علمبردار تھے۔ قومیت کا جذبہ ان کی رگ رگ میں جاری وساری تھا۔ وہ ہر قسم کے مطالب کو اپنی زبان میں نہایت آسانی سے ادا کرتے ہیں۔ کیسا ہی مشکل اور دقیق مضمون ہو وہ نہایت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے ہیں۔ چونکہ چند مخصوص اصولوں کی تبلیغ اور ایک خاص نظریۂ زندگی کی تلقین کر رہے تھے اس لئے عبارت میں منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔ مولانا حالؔی کا خیال ہے کہ سرسیّد اردو نثر کے آدم ہیں۔ سرسیّد اور غالبؔ کے معاصرانہ تعلقات کی بنا پر مصنف تاریخ ادب اردو کا خیال ہے کہ:

"مرزا کی طرزِ خاص کا سرسید پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور

# سرسیّد مرحوم اور اردو لٹریچر

## از شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور و اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔ سرسید کی جس زمانہ میں نشو و نما ہوئی دلّی میں اہل کمال کا مجمع تھا اور امراء اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقے تک علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔

بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقشِ اوّل غالب کے
ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔"

سر سید پر برابر اعتراضات ہوئے چنانچہ ان کو کافر، ملحد، نیچری وغیرہ
بھی کہا گیا۔ لیکن سر سید نے ان اعتراضات کے جواب میں ہمیشہ متانت اور
سنجیدگی کو دخل دیا۔ دلیل بے دعویٰ کے مقابلے میں وہ اپنی مخصوص ظرافت
خوش طبعی سے کام لیتے تھے۔ ان کے یہاں تمثیلیں برجستہ، تلمیحیں لطیف، کہاوتیں
اور اشعار برمحل نظر آتے ہیں۔ وہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے ایک ہی
جملہ کو مختلف طریقے سے لکھتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر الفاظ یا فقروں کی تکرار
پائی جاتی ہے۔ یہ تکرار کہیں اچھی معلوم ہوتی ہے اور کہیں بری۔ مگر سر سید اس
کے ضرورت سے زیادہ عادی تھے۔ وہ موضوعات کی رعایت سے خاص الفاظ
کا انتخاب کرتے تھے۔ ان کے مضامین میں انگریزی الفاظ کی کثرت ملتی ہے۔
انھوں نے ایسے انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن کے مترادفات
اردو میں نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں۔ شاید یہ زمانہ کا رجحان تھا جو ان
کے رفقا میں بھی پایا جاتا ہے۔ سر سید کی تمام تحریروں میں خلوص اور صداقت
بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ سے عبارت میں ایک قسم کی گرمی اور اثر پیدا
ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پگھل کر ایک دوسرے سے پیوست
ہو گئے ہیں۔

---

سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور انھیں بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔ اوّل وہ رواجِ عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے۔ آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا ایک مصرعہ انھیں کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے ع

نام میرا تھا کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ چونکہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لئے دلّی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے۔ خصوصاً میر امن صاحب کی "چہار درویش" جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی اور اس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصانیف کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا، یعنی عمارات و ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے اِبا کرتا تھا۔ تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید

کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلام پڑھتے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔ سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ "آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیئے ہیں۔"

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے "اردو اخبار" کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا جس کا نام سید الاخبار تھا اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں مانی جاتی تھی، اس لئے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں جہاں انشا پردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا۔ آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و

غم، حسرت وخوشی، حسرت وبکیسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو اخبار جاری ہو گئے اور اردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدّنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا۔ اسی لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔ ۱۲۸۷ھ میں جس کو آج کم وبیش ۲۷ برس ہوئے، سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سرسید نے اردو زبان میں جو باتیں پیدا کیں اس کو وہ مختصراً تہذیب الاخلاق میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ان کی خاص عبارت یہ ہے:

”جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات واستعارات خیالی

سے بھری ہوئی ہیں اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"۔

اس آرٹیکل میں سرسید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گذرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدی رزم کے مرد میدان نہیں۔ نظامی رزم بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں۔ ظہوری صرف مزاحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔

امید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں امید کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے

دھندھے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔

ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔

سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ، اے میرے دل کی کونپل سورہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے۔

سورہ میرے بچے سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا ہمارے دل کو تسلی دیں گے، سورہ میرے بچے سورہ، میرے بالے سورہ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑھا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتشِ محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں۔ اور ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد

سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔ وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں
کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب
کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا
میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی
جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر
نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے
اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی
ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی
توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین
پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادروں
کی ماں، تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کے دل کو تقوت دیتا
ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔"

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور
اس میں کس قدر درد و اثر پیدا کیا ہے۔

پالیٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونی ورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورینٹل تعلیم پر
بہت زور دیا گیا تھا۔ سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالیٹکس کی بنا
پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اس وقت سرسید نے پے در پے تین
آرٹیکل لکھے۔ ان آرٹیکلوں نے یونی ورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص

ان آرٹیکلوں کے جواب میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے اور ان کا مجموعہ یکجا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی۔ افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسید نے انشاپردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کئے ان میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا لیکن ترجمہ کے ذریعے سے نہیں کیوں کہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے۔ بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو میں، اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کئے، امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کئے ہیں دراصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گذرے ہیں۔ سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔

سرسید کی انشاپردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں لکھنا چاہا تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گذرا ہے، اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

"عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے"۔
رینان جن مسائل کو ادا کرنے کے لئے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے
(گویہ اس کا خیال محض غلط ہے) سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ
مسائل ادا کر دیئے ہیں۔
سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے
وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں
زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف
تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا تاہم
اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو
زبان میں ادا کیا ہے کوئی شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔
سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے لیکن نہایت
تہذیب اور لطافت کے ساتھ۔ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سرسید کے
رد میں رسالے لکھا کرتے تھے حرمین شریفین گئے وہاں سے سرسید کی تکفیر
کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسید ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:
"جو صاحب ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے
تھے اور ہماری تکفیر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا۔ ان کے لائے
ہوئے فتووں کو دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔
سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو
کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے"۔

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا ہے تو سر سید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

"سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے کچھ جھنجھلائے، ادھر ہات جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آ گئی ہے۔ اگرچہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیئے۔ بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم کبھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔"

حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے اردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لئے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے۔ وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا ؂

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

---

# تعصُب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیوں کہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیوں کہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصب کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے۔ مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم

وتربیت کے قابل نہیں ہوتا۔
بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا عقل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔
مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلّت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لئے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔
ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ بڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط نما نیکی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں اور تمام ان علوم اور فنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور برا سمجھے۔ اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں

کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔

پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیوں کہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لئے ہو سکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی نیکیوں اور خوبیوں کو پھیلاتا ہے۔ اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں اور برا کہنے والوں کی باتوں

کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعیہ پر متحد ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی بد خصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے، اپنے مذہب کے حسنِ اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا ہارج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور متقشف سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیتِ کریمہ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ[1] سے مخالفتِ صریح کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسرے کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جائیں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں بلکہ مخالفوں کی فتحیابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرض کہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت

---

[1] اگر تم (رسول اللہ) سخت دل ہوتے تو لوگ تمھارے پاس سے بھاگ جاتے۔

برا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا اور مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور اوپری دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیاز مندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک اور بد خصلت نفاق اور کذب اور دغا بازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بد نصیب رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصولِ معاش اور دنیاوی عزت و تمول مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس اور کیا کر رہے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ بیا کیا بن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھِلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر وکمال اس میں نہیں آتا۔ تربیت وشائستگی، تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نمانیکی کے پردہ میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سمِ قاتل ہوتا ہے کیوں کہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب وبرباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہئے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اس کی ہم کو پیروی چاہئے۔

---

# تکمیل

ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے[1] را زوالے"، مگر اس کے معنی اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک اور بڑے حکیم نے اسی مطلب کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "ہم کو اپنے تئیں درجہ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے اور بلا شبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے تو اس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کی ایجاد سے باز رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا زوال آجاتا ہے۔

کامل مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہے۔ پس جو کچھ کہ خدا نے کیا یا کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے اور اس کے سوا اور کوئی چیز جو انسان نے کی ہو یا کہی ہو کامل نہیں ہے کیوں کہ قابلِ سہو و خطا ہونا انسان کی شان سے ہے۔ اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائج عقل انسانی ہیں، ان کو کامل سمجھ لینا ہماری ٹھیٹ غلطی اور ہمارے تنزل و ادبار

---

[1] ہر بڑھنے والی چیز کو زوال ہے۔

کی ٹھیک نشانی ہے۔

کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے۔

جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں۔ ہم میں ایک استغنا پیدا ہوتا ہے جس سے سوائے اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس بات کے فائدہ سے محروم رہتے ہیں۔

لوگوں کے اعتراضوں کے سننے کو گوارا نہیں کرتے اور اس سبب سے اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں ہوتے اور جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں۔ کوشش سے جو ایک ترقی کا فائدہ ہے اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔

خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے اور جس کا یہ فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لاویں۔ اوروں پر بھروسا کر کر اس کو بیکار کر دیتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتے بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں کیوں کہ ہماری اور ہماری آیندہ نسلوں کی عقل اور جودت طبع اور تیزیِ ذہن اور طاقت انتقال ذہنی اور قوت ایجاد سب مٹ جاتی ہے اور صرف اوروں کی ٹٹکاری[1] پر ہماری چال رہ جاتی ہے۔ اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ "چارپائے بر و کتابے[2] چند"۔

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہنچا دیا ہے اور جو

---

[1] بڑھنا۔ [2] اگر جانوروں پر کتابیں لاد دی جائیں تو وہ نہیں جانتا کہ اس کی پشت پر کتابوں کا دفتر ہے یا ایندھن ہے۔

نقصان دینی اور دنیوی اس سے ہم نے اٹھائے ہیں ان کی کچھ انتہا نہیں۔
بھلا دینی باتوں کو اس وقت رہنے دو اور صرف اس بات پر غور کرو کہ دنیوی علوم اور دنیوی کاروبار اور دنیا کی باہمی معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور طریقہ تعلیم اور تربیت اور ترقی علم مجلس میں کیوں ہم نہ کوشش کریں اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی کی ہے ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں۔
ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم، اس کے فلسفہ اور اس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے نہ سمجھیں۔ بوعلی کچھ صاحبِ وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دنیوی ہم مدت دراز سے بڑھتے آتے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے انہی پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں۔
یہ جو کچھ ہم نے کہا یہ صرف خیالی ہی باتیں نہیں ہیں بلکہ اس وقت دنیا میں ہمارے سامنے اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔
ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچا ہوا اور ناقابلِ سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور اسی کی پیروی پر جمے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسری نے

کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم وفنون وطریقہ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اب دیکھ لو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آتے ہیں۔ انگریز، فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پہلی قومیں علم وہنر تربیت وشائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہمعصر قوموں سے مقدم اور اور اعلیٰ تھیں اور شاید مسلمانوں کو یہ بھی عزت تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لئے بمنزلہ استاد کے گنے جاتے تھے۔ مگر اسی عیب نے جو ان قوموں میں تھا اور اب بھی ہے اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے ٹھیک ٹھیک معاملہ بالعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیا کی قوموں سے علم وہنر، تربیت وشائستگی میں اعلیٰ ہیں پس میرا مطلب صرف یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی چاہیئے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات سے جنھوں نے اس کی عقل اور سمجھ کو بالکل خراب کر رکھا ہے اور ان کی تمام خوبیوں کو خیالات فاسد کے کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ کر دیا ہے خالی کریں اور علوم اور فنون اور تہذیب وشائستگی میں ترقی کرنے کی کوشش کریں اور انصاف سے دیکھیں کہ ان کی تہذیب اور شائستگی میں نقصان ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی ہے اور ان عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کی بدولت ان کو دیئے تھے بری طرح استعمال میں لانے اور ان کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام کو ہماری نالائقی کی بدولت

کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں، کیسے خندہ زن اشارات اور کنایات اس پر کرتی ہیں اور ہماری شامتِ اعمال کو نتیجہ مذہب اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بیجا نہیں ہے۔ اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ سو انھوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے کہ جو کوئی نفرت کرے کچھ تعجب نہیں۔ پس اب میری یہ خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں کوشش کرکر اور اپنے حال اور چال چلن کو درست اور عمدہ کرکر اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھا دیں۔

---

# رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے اخذ کر کر لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ "انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقص واقع نہ ہو بلکہ سب کا مل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔" مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشا معدوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم ورواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوش حالی کا ایک جزو موجود نہیں ہے اور جو کہ خوش حالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہو گی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیئے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے مطابق کوئی بھی نہ کرنی چاہیئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں ان کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوتِ تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے۔ اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔

البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوتِ تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوتِ استقرار اور بھلا برا ٹھہرانے کو قوتِ امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے قوتِ استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔ آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے۔ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھولے اور پھلے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ مفید ہیں ان کو اختیار کریں۔ جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات

کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا دہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانے میں ہر شخص اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک رسم ورواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند یا ناپسند کے لائق کیا بات ہے یا عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کون سی بات ان کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبہ کے کون سی چیز مناسب ہے میرے رتبہ اور مقدرر کے آدمی کس رسم ورواج کے مطابق کام کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے بدتر ہیں اور رتبہ اور مقدرر میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجالاتے ہیں تاکہ یہ شخص ویسا ہی کر کر انہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجالاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے

ہیں اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابندی کی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اول دل میں آتا ہے۔ غرض کہ ان کی پسند وہی ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کی ہے۔ وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے۔ یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے کرتے ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں اور ان کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بے کار رہنے کے سبب بالکلیہ ضایع ہو جاتی ہیں اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبع زاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔

رسوبات جو مقرر ہوتی ہیں غالباً اس زمانہ میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسا کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں غلطی ہو، ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح نہ بیان ہوا ہو یا وہ رسم اس وقت

اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودت طبع اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسوبات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کے مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں۔ الا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ طبعی کے جس کے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔

اب اس رائے کا دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا

مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ پس اب دیکھ لو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوتِ عقل اور جودت طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں اس لئے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسنِ معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں انھوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور انہی وجوہات سے دنیا کی بہت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے مگر اب ان کا حال دیکھو کہ کیا ہے اسی رسومات کی پابندی سے ان کا مآل یہ ہوا ہے کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں جن کے آباو اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے جب وقت ان قوموں کے آبا و اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانہ میں ان قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی بھی تو اس کے ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ

یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا اور تنزل اور ذلت وخواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟

یہ اعتراض سچ ہے اور حقیقت۔ یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی جیسے کہ اب تک ہوتی رہتی ہے تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندئ رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں، فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جائے گی اور نئی رسم اختیار کر لی جائے گی۔ اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالتِ تمیز اور قوتِ ایجاد ضایع نہیں ہوتی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے ان کے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا شکل اور رنگ

کی لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق کریں اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تاوقتیکہ ان کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی بات اس کی تنزل کا باعث ہو گی۔ بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حب وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ جو حالات کہ اب خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوتی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگوں اور مختلف پیشہ والے گویا جدی جدی

دنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادات جدا جدا تھیں۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور یک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شایع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ

بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی
رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و
راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور
ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہوسکتا۔

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے
باعثِ تنزل قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں کہ یہ عمدہ نتیجہ باعثِ
تنزل ہوگا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادات اور
خیال کے ہوجاتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جزئی باتوں کے ایجاد
کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعدِ حسنِ معاشرت کو ترقی دینے
کی ہیں زائل اور کمزور ہوجاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی
ہے۔ اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہوجاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی
ہے۔ چینی بہت لئیق آدمی ہیں بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جائے تو عقلمند
بھی ہیں اور ان کا سبب یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی
قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہوگئیں۔ اور یہ کام ان لوگوں کا تھا جو اس
قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس بات میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش
اور عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے
کے واسطے اور اس بات کے لئے کہ جن شخصوں کو وہ دانش مندی کی باتیں حاصل

ہیں ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں بیشک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انھوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پالیا اور اس لئے چاہیے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر ان کی کبھی کچھ اور ترقی ہو گی تو بیشک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہو گی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان میں سے معدوم ہو گئیں۔

پس جب کہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات کبھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں پھر ہم ان رسوموں کے پابند ہوں اور نہ ان کی بھلائی برائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھندی سے اس کی پیروی کرتے چلے جاویں تو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے اور آیندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے کبھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک

کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاویں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو تب پھر ہم اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں۔

مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے ازراہِ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بہ سبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

مگر چونکہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جس کو ہم دل سے سچ جانتے ہیں اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضرور ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو بات معاشرت اور تمدّن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کے اختیار کرتے ہیں اس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ سے۔ درصورت ثانی بلاشبہ ہم کو احتراز کرنا چاہئے اور درصورت اوّل بلالحاظ پابندی رسوم کے اور بلالحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں یا بھلا اس کو اختیار کرنا ضروری بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے:

خدا ہمہ مسلمانان را بریں کار توفیق دہد[1]۔ آمین

---

[1] خدا تمام مسلمانوں کو یہی توفیق عطا فرمائے۔

# عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جائے۔ اگر تمثیلاً کہا جائے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپیہ کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کی بڑی حامی کار ہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لایعقل اور لاشے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبدّل ہو جاتی ہے۔ وہ کسی قسم کے معاہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لئے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے بہ قبضہ شوہر آجاتی ہے۔

جو جائداد کہ عورت کو وراثتاً قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تاحین وحیات قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا محاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لایعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کرسکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کرسکتا ہے۔ وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کرسکتی۔ وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لئے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کرسکتی۔

۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائداد کا ایک بل پیش ہوا تھا۔ اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی کہ وہ قانون جس کے ذریعہ سے بعد شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہو جاتی ہے منسوخ کیا جاوے۔

آنریبل مسٹر رسل گرے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون کا پیش کیا تھا اس وقت انھوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ حال کے قانون کے بموجب جو کچھ جائداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت و لیاقت سے کماتی ہے بعد شادی کے وہ اس کا نہیں رہتا سب پر شوہر مالک ہو جاتا ہے۔ پس شادی کا اثر اس عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائداد کا اثر ہوتا ہے۔

اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے آنریبل مسٹر رسل گرے کی بات کی تائید کی پس انگلستان کے قانون کا عورتوں کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

---

# تعلیم و تربیت

ایک مصنف کی ایک بات کو ہم اپنی طرز پر اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔
تعلیم اور تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں،
جو کچھ کہ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی
کام کے لائق کرنا اس کا تربیت کرنا ہے۔ مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان
میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور
اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔
انسان کو تعلیم درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ
اس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے
جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا
ہے اور انسان کو تربیت کرنا اس کے لئے سامان کا مہیا کرنا اور اس سے کام
کا لینا ہے جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے
بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا کبھی پانا ضروری نہیں ہے۔
تربیت جتنی چاہو کرو۔ اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو۔ مگر
اس سے دل کی سرچی سوتیں نہیں کھلتیں بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ اندرونی قویٰ

کو حرکت دیئے بغیر تربیت ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی اس لئے ممکن ہے
کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو اور تعلیم بہت بری ہو۔ یہی ٹھیک ٹھیک
حال ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت
اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت
ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار جبہ اور کرتہ سے بہت کچھ مگر دل
کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں
کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے۔ بلکہ اس
قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو۔
جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے
نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے
روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و
غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر اور قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں
رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ شگفتگی کے اعتبار سے بالکل
مردہ ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم
پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور
ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے
کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی
علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے۔

اس تقریر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل

ہے یہی۔ ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔
علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو شگفتہ و شاداب
کرے ان کو پژمردہ کر دیتا ہے اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں
کے ہیں بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں
کیا دین کے اور کیا دنیا کے خراب ہوتی چلی جاتی ہے بس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے
اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے
اور دل کی سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی
سرسبز و شاداب ہو۔

---

# کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا۔ اٹھنے بیٹھنے چلنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوئ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیّا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قوئ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہو گا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل

کو ضرورتاً کام میں لاوے لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور
اپنے دلی قویٰ کو بےکار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا
ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوان کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی
قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی
خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ
کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بےکار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو
مناسب ہو اور اس کو حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ
پڑے جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا اور
وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اس کے
عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار
کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماشبینی کا عادی ہوگا۔ اور یہی سب
باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں البتہ فرق اتنا ہوتا ہے کہ وہ
پھوہڑ، بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار شہری ہوتا ہے۔ شراب
پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور
جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اوڑانا اس کو
پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ
مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام

بہت کم ہیں جن میں ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے۔ مگر ہم اپنے وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قوی کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے۔ کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہئے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کا بیکار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎

بے کار مباش کچھ کیا کر   گر نہ کر سکے تو کچھ کھا کر

---

# اخلاق

مسٹر اڈیسن کا قول ہے کہ مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک اعتقادیات دوسرا عملیات۔ مسٹر اڈیسن کی غرض اعتقادیات سے صرف وہ مسائل ہیں جو وحی سے معلوم ہوئے ہیں اور عقل سے یا کارخانۂ قدرت پر غور کرنے سے معلوم نہیں ہو سکتے مگر ہم کو ان کے اس بیان سے کسی قدر اختلاف ہے۔ ہم اعتقادیات ان مسائل کو کہتے ہیں جن کا ہونا عقل و نیچر یعنی کارخانہ قدرت کے اصول پر ناممکن نہیں ہیں۔ الاہم ان دونوں کی بنا پر ان کے ہونے کا یقین نہیں کر سکتے تھے۔ وحی نے صرف ان کے ہونے پر جب وہ ہوں ہم کو یقین دلایا ہے یا ان کا نہ ہونا بتلایا ہے۔ ہم نے اس مقام پر حرف تردید کو اس لئے استعمال کیا ہے کہ ہم کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان مسائل پر جن کو ہم نے اعتقادیات میں داخل کیا ہے یقین لانا جزو ایمان ہے یا نہیں۔ عملیات میں مسٹر اڈیسن نے ان مسائل کو داخل کیا ہے جن کو عقل و نیچر کے مطابق مذہب نے بھی ہدایت کی ہے۔ پس وہ پہلے حصے کا نام عقاید رکھتے ہیں اور دوسرے حصے کا نام اخلاق۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ہم اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اعتقادیات پر اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اخلاق کو بالکل بھول جاتے ہیں اور بعضے اخلاق پر ایسے

متوجہ ہوتے ہیں کہ اعتقادیات کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ صاحبِ کمال آدمی کو دونوں میں سے کسی بات میں ناقص نہ رہنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہر ایک سے کیا کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ دل سے ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔

افسوس ہے کہ اس مقام پر بھی مجھ کو مسٹر اڈیسن سے کچھ تھوڑا سا اختلاف ہے۔ پچھلا حصّہ ان کے اس مضمون کا نہایت سچ ہے مگر پہلے حصّے میں کچھ غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتقادیات میں اور عملیات میں جس کو مسٹر اڈیسن اخلاق کہتے ہیں کچھ علاقہ نہیں ہے۔ انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے اس کے اخلاق میں کچھ تفاوت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہو اس کے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آسکتا کیوں کہ یہ دونوں کام دو جدا جدا حالتوں اور دو جدا جدا شخصوں سے متعلق ہیں پہلا ہمارا دل یا ہماری روح اور خدا سے دوسرا ہماری ظاہری حرکات اور جذبات اور انسان سے ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ گو مذہب اخلاق اور اعتقاد پر منقسم ہے اور ان دونوں میں خاص خاص خوبیاں ہیں مگر اخلاق کو اعتقاد پر اکثر باتوں میں ترجیح ہے۔

ا۔ کیوں کہ اخلاق کی اکثر باتیں نہایت صحیح اور مضبوط ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اعتقاد بالکل قائم نہ رہے تب بھی وہ باتیں (یعنی اخلاق کے مسائل) بدستور قائم رہتے ہیں۔

۲۔ جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وہ شخص بہ نسبت اس شخص کے کہ جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں انسان کے لئے دنیا میں بہت زیادہ

بہتری کر سکتا ہے اور میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کے لئے دین اور دنیا دونوں میں بھلائی کر سکتا ہے۔

۳۔ اخلاق انسان کی فطرت کو زیادہ کمال بخشتا ہے کیوں کہ اس سے دل کو قرار و آسودگی ہوتی ہے۔ دل کے جذبات اعتدال پر رہتے ہیں اور انسان کی خوشی کو ترقی ہوتی ہے۔

۴۔ اخلاق میں ایک نہایت زیادہ فائدہ اعتقاد سے یہ ہے کہ اگر وہ ٹھیک ٹھیک ہوں تو تمام دنیا کی مہذب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں میں متفق ہوتی ہیں گو کہ عقاید میں وہ کیسی ہی مختلف ہوں۔

۵۔ کفر سے بھی بد اخلاقی زیادہ بدتر ہے یا اس مطلب کو یوں کہو کہ اکثر لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک نیک چلن نیٹ جاہل وحشی جس کو خدا کی باتوں کی کچھ خبر کبھی نہیں پہنچی نجات پا سکتا ہے مگر بد چلن معتقد آدمی نجات نہیں پا سکتا۔

۶۔ اعتقاد کی خوبی اسی میں ہے کہ اس کا اثر اخلاق پر ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اعتقاد کی یعنی خدا کے دیئے ہوئے مذہب پر ایمان رکھنے کی خوبیاں کیا ہیں تو کیا ہم کو اس بات کی صحت جو ہم نے ابھی بیان کی بخوبی معلوم ہو جاوے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی خوبیاں ان باتوں میں ہیں جن کو میں بیان کرتا ہوں۔

(۱) اخلاق کی باتوں کو سمجھنا اور ان کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانا۔

(۲) نیک اخلاق پر عمل کرنے کے لئے نئے نئے اور قوی اغراض کو

بہم پہنچانا

(۳) خدا کی نسبت عمدہ خیالات پیدا کرنا اور اپنے ہم جنسوں میں اچھا برتاؤ کرنا جس سے آپس میں محبت زیادہ ہو اور خود انسان اپنی سچی حالت کو کیا بلحاظ اپنے نیچر کی خوبی کے اور کیا بلحاظ اس کی بدی کے بخوبی سمجھے۔

(۴) برائی کی برائیوں کو ظاہر کرنا۔

(۵) نجات کے لئے نیک اخلاق کو عام ذریعہ ٹھہرانا۔

مذہب کی خوبیوں کا یہ ایک مختصر بیان ہے مگر جو لوگ اس قسم کے مباحثوں میں مشغول رہتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان خیالوں میں ترقی دے سکتے ہیں اور مفید نتیجے ان سے نکال سکتے ہیں۔ مگر میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ ان سب باتوں کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اخلاق میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اخلاق کو عیسائی مذہب کا سہارا نہ ہو۔ یہ قول مسٹر اڈیسن کا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی اعتقاد یا کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا درکار نہیں ہے بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کو اخلاق کا سہارا درکار ہے۔

مسٹر اڈیسن اور بھی دو ایک اصول قائم کرتے ہیں جو اس گفتگو سے علاقہ رکھتے ہیں۔

۱۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو ایسی بات کو اعتقاد کی جڑ نہ قرار دینا چاہئے جس سے اخلاق کو استحکام اور ترقی نہ ہوتی ہو۔

۲۔ کوئی اعتقاد صحیح بنیاد پر ہو ہی نہیں سکتا جس سے اخلاق خراب یا

ان میں تنزّل ہوتا ہے۔

یہ دونوں اصول مسٹر اڈیسن کے ایسے عمدہ ہیں کہ دنیا میں کوئی شخص جس کے دل کی آنکھ خدا نے اندھی نہ کی ہو ان سے انکار نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد مسٹر اڈیسن انھیں اصولوں پر ایک اور مسئلہ متفرع[1] کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام مشتبہ مقاموں میں ہم کو غور کرنی چاہئے کہ اگر بالفرض وہ غلط ہوں تو اس سے کیا کیا بد نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایمان کے مضبوط کرنے اور خیالی ثواب حاصل کرنے کی امنگ میں لوگوں کو تکلیف دینا، لوگوں کے دلوں میں رنج اور نفرت، غصّہ اور سخت عداوت پیدا کرنا اور جس چیز پر ان کو اعتقاد نہیں ہے زبردستی ان سے قبول کروانا۔ ایسے جذبات میں ہم اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ان سب باتوں کے سوا ہم ان کو دنیا کے فائدے اور خوشی سے محروم کرتے ہیں۔ ان کے جسم کو تکلیف دیتے ہیں، ان کی دولت کو خراب کرتے ہیں۔ ان کی نامہریوں کو خاک میں ملاتے ہیں۔ ان کے خاندانوں کو برباد کرتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو تلخ کر ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار ان کو مار ڈالتے ہیں۔ پس جب کسی مسئلہ سے ایسے بد نتیجے نکلیں تو مجھ کو اس مسئلہ کے مشکوک ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا جیسے کہ علم حساب میں دو اور دو چار ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہوتا پس ایسے مسئلہ کو اپنے مذہب کی بنیاد نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ اس پر عمل کر سکتا ہوں۔ اس قسم کے معاملات میں ہم صریح اپنے ہم جنسوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اور جس مسئلہ سے ہم ایسا کرتے ہیں بلاشبہ وہ مشکوک اور قابلِ اعتراض ہے۔ اخلاق

---

[1] اخذ کرنا۔ نکالنا۔

اس سے بالکل خراب ہو جاتے ہیں۔

یہ مضمون مسٹر اڈیسن کا غالباً عیسائی مذہب کے اس زمانہ پر اشارہ ہے جب کہ رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقہ میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی اور مرد اور عورت و بچے مذہب نہ ماننے پر آگ میں جلائے جاتے تھے اور نہایت بدبخت خون ریزیاں جو درحقیقت کرسچانٹی کے بالکل برخلاف ہیں ہو رہی تھیں۔

لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب میں بھی ایسا ہی خونخوار امن واخلاق کے برخلاف جہاد کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ مسئلہ درحقیقت ایسا ہی ہو جیسا کہ بعض یا اکثر حقیقت تک نہ پہنچنے والے یا خود غرض لوگوں نے سمجھا ہے یا اکثر ظالم و مکار مسلمان حکمرانوں نے برتا ہے تو اس کے اخلاق کے برخلاف ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے بلکہ یہ جو حقیقت جہاد کی درحقیقت مذہب اسلام کی رو سے ہے وہ اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا کسی کے مذہب کو بجبر چھڑانا یا مذہب کے لئے کسی کا خون بہانا مطلق نہیں ہے۔ وہ صرف نیشنل لا پر یعنی اس قانون پر جو مختلف قوموں کو آپس میں برتنا چاہئے مبنی ہے اور جو آج کل مہذب سے مہذب قوموں میں جاری ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر ہم نے اپنی متعدد تصنیفات میں کیا ہے اور امید ہے کہ کبھی اس مضمون پر کوئی تحریر اس پرچہ میں بھی چھاپیں گے۔

مسٹر اڈیسن اپنے اس مضمون کو کسی مصنف کے نہایت عمدہ اور دل میں اثر کرنے والے کلام پر ختم کرتے ہیں اور وہ کلام یہ ہے۔

"آپس میں نفرت پیدا کرنے کو تو ہمارے لئے مذہب کافی
ہے مگر ایک دوسرے میں محبت پیدا کرنے کے لئے کافی
نہیں"۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو برتاؤ مذہبوں کا اس زمانہ میں ہے
وہ ایسا ہی ہے اور مسلمانوں کا برتاؤ سب سے زیادہ برا ہے مگر سچے مذہب
کا یعنی اسلام کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ — "خدا کو ایک جاننا اور انسان کو اپنا
بھائی سمجھنا"، پس جو کوئی اس مسئلہ کے برخلاف ہے وہ غلطی پر ہے۔

# ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیا دار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں وہ بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں وہ تو دیندار کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں اور دن رات عشق و تماش بینی اور رچ پنے کی باتوں کی جن کو دراصل انھوں نے کیا بھی نہیں گپیں اڑاتے ہیں۔ اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انھیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکہ میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان سے انھیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں

پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے نہایت
دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات
کی ہے۔ "کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے
پاک کر"۔ جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے
کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں اور
اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی
نصیحت کے محتاج ہیں۔ پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے
وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان
اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا معلوم ہو سکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں
کو جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں جانچیں اور اپنی زندگی
کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا کہ اِنَّمَا بشرٌ مثلکم
یُوحیٰ اِلیّ انما الٰهکم الٰه واحد[1] اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا جہاں
تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ
ہے اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے بڑا ہادی
اور بہت بڑا دانا استاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی
غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس میں

---

[1] رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ "بلاشک میں تمہاری طرح انسان ہوں بس میرے پاس وحی آتی ہے (اور
تمہارے پاس نہیں آتی) اور بے شک تمہارا معبود ایک ہے۔

اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا۔ اور کچھ زمانہ کے گذرنے
سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گذرے معلوم نہیں ہو سکتی۔
اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے
پر میں اکتفا نہیں کرتا بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک
ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس
بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے
دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں
معلوم ہوتے اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے
کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی
خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے
سے ڈھونڈھ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت
بڑا کر دیتا ہے مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔ ع

تا نباشد[1] چیزکے مردم نگویند چیز ہا

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو۔
اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیئے کہ ہم کو ہمارے عیبوں
سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن
سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیئے تھا۔

[1] جب تھوڑی چیز ہوتی ہے تو اس کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدہ سے خالی نہیں۔
اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو
خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ
"دشمن از دوست ناصح ترست ایں جز نکوئی نہ گوید وایں جز
بدی بخوید[1]"۔

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اس میں اس نے یہ بات
لکھی ہے کہ "دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم
ہوتی ہیں اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریر میں جو
نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔"

علیٰ ہٰذا القیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اس
بات پر غور کرنا چاہیئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں اس میں سے ہم کس
قدر کے مستحق ہیں اور پھر یہ سوچنا چاہیئے کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے
ہیں وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دنیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے
کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری
تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں در اصل ہم میں کہاں تک ہیں۔
ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضرور ہے کیوں کہ ہمارا یہ حال ہے
کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کر اپنے تئیں بہت بڑا

---

[1] دشمن دوست سے زیادہ ناصح ہے اس لئے کہ وہ (دوست) سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں کہتا اور وہ
(دشمن) سوائے برائی کے اور کچھ نہیں کہتا۔

سمجھنے لگتے ہیں اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے اس کے مقابلہ میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہیئے بلکہ ان لوگوں کی رایوں کی بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیئے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے اختلاف کیا ہے یا کسی بیرونی دباؤ یا پابندی رسم و رواج اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکہ کھانے کا احتمال ہے وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو برا اور حقیر سمجھنا یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں وہ فی نفسہٖ نہایت ہی بری ہیں گو کہ وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہوں مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت مشہور ہیں مگر نہایت لغو اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے۔ میں اس بات کو اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند

اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی گناہ سے پاک ہو۔

اسی طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیئے جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی خاص شوق سے یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہیں جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے اور اس کا دل غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے تعصب اور ہزاروں غلطیاں اور پوشیدہ برائیاں اور لامعلوم عیب انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو اس کے کرنے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہیئے کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی برائی چھپی ہوئی ہوگی۔

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا ہمارے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کا جاننے والا ہمارے دل کو جانچے گا جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں۔ تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھایا کہ خدا ہر جگہ ہر حاضر و ناظر ہے ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا ہے تو اس کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی ہم کو بتلا دی

جس سے انسان دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو ہی فریب میں ڈالتا ہے۔ داؤدؑ نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ "اے خدا مجھ کو جانچ، میرے دل کی تہہ کو ڈھونڈھ، میرے خیالوں کو دیکھ، مجھ کو بخوبی پرکھ کہ مجھ میں کس برائی نے راہ کی ہے اور مجھ کو ایسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ کو قائم رہے۔"

---

# مخالفت

دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اسی شخص میں کمینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کچھ نقصان پہنچا دے خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔

دشمنی اور عداوت کا منشا اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن یا زر، زمین یا خون اس جذبہ کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔

حسد کا منشار صرف وہ اوصافِ حمیدہ ہوتے ہیں جو محسود میں ہیں اور حاسد ان کا خواہاں ہے مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے سے ہوتی ہے۔

مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے اس کا منشار نہ زر و زمین و زن کی کمی ہوتی ہے اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصافِ حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں

ہوتی۔ بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخالفت رائے یا عقل و سمجھ دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔

یہ جذبۂ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے مگر مہذب اور تربیت یافتہ اور نیک دل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے اور نامہذب اور ناتربیت یافتہ بدذات آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اٹھاتا ہے اور دوسرا ان فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے اور دنیا میں خود اپنے تئیں بدطینت اور کذّاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے۔

دنیا میں یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لئے نہایت دل چسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کی حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا

ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہمارے مخالف اس پچھلے طریقے پر ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ ہم کو اپنی مخالفت کا یا اپنے پر اتہام کرنے کا یا اپنی بدنامی کا بہ کچھ اندیشہ نہیں ہے بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ انجام کو ہمارے مخالف ہی رسوا وبدنام ہوتے ہیں اور دنیا انہی کو دروغ گو وکذّاب قرار دیتی ہے۔ اگر ان کو ہمارے حال پر رحم نہیں ہے تو خود ان کو اپنے حال پر رحم کرنا چاہئے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ[1]

---

[1] اے اللہ ہماری کوشش کو قبول کر کیوں کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ہے سخت کلامی درشت گوئی، سب وشتم اپنا پیشہ کرلیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد لَعۡنَةُ اللّٰہِ عَلَى الۡکَاذِبِیۡنَ[1] بنتا ہے۔ اس راہ پر چلنے سے اور جھوٹ اتہام کرنے سے اور لعنت خدا کا مورد بننے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کے حال کو بدنام کرنا اور عام لوگوں میں جو اس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں ناراضی پیدا کرنا ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کا یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا اور بعوض اس کے کہ اس کا مخالف بدنام ہو خود وہی زیادہ رسوا اور بدنام ہوتا ہے اس لیے کہ جب اس کے مخالف کی برائی جو اس نے براہ کذب واتہام اس کی نسبت منسوب کی مشہور ہوتی ہے تو کوئی اس کو سچ سمجھتا ہے اور بہت لوگ اس کی تحقیق کے درپے ہوتے ہیں اور جب اس کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بعوض اس کے مخالف کے خود اسی کذاب پر لعنت اور تھوہ تھوہ کرتے ہیں اور بقول شخصے کہ دروغ کو فروغ نہیں ہوتا تھوڑے ہی دنوں میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ جھوٹا بدگو خود اسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لئے کھودا تھا۔ پس انسان کو چاہئے کہ اپنے مخالف سے کبھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے، ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔

---

[1] جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

# خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ

کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جب کہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالہ کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہیں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جائیں کیوں کہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے

کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اس طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز

بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

---

# گزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور نہ بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت ہائے گذرے ہوئے زمانے۔ افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر

میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوش کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا "آہ ابھی بہت وقت ہے"۔ اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتّے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں تب وہ چلا کر بولا "ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات"۔ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن، دوست، آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گذر

گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے، دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو"۔

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا ٹکراتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن نہ وہ دل رہا تھا اور نہ وہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں

کو جن کی خدمت کی تھی اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بجھو کے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھیرے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا۔ "ہائے وقت ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دلی اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے۔ نہایت آسان، بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ واللہ لا[1]

---

[1] اللہ نہ زیادہ کرتا ہے اور نہ کم کرتا ہے۔

یزید ولا انقص ادا کرکہ انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مستخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے مساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلّا اٹھا "ہائے وقت ہائے وقت۔ کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگاکر اس کی بچی لی اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہاکہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے، کیوں تو بے قرار ہے، کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منھ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلھن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکار اکہ "او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤں گا اور ضرور اس دلھن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا او خدا تو میری مدد کر۔ آمین

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین۔

---

# بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور رہا وہ دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ

بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں لپا دگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے لیٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے تو کہیں تو تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کو پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب اور شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا شاید میں غلط سمجھا گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمھارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمھارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیوں کہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبّت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی

ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو، اس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کرلو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

---

# امید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمان کے تارے تمھاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو، اے پہاڑ کے عالی شان درختو، اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمھارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے۔ تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے۔ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں، کیا وہ ہم کو آیندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔

تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور و دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لئے نام آوری، نام آوری کے لئے بہادری، بہادری کے لئے فیاضی، فیاضی کے لئے محبت، محبت کے لئے نیکی، نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں۔

وہ پہلا گنہ گار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس نا امید کو نا امید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اسی اعلیٰ درجے پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی، تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی

طرح پہنچی ۔ جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی اور اے نا امید دلوں کی تسلّی امّید۔ تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محبت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے درمیان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت۔ تیری لیاقت۔ تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخر کار

ہمارے دل کو تسلّی دیں گی ۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اوجالا ہو گی۔
تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی ۔ تیری آواز ہمارے لئے
خوش آیندہ راگنیاں ہوں گی ۔ سورہ میرے بچے سورہ ۔ اے ہماری امیدوں
کے پودے سورہ ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم
کیا کرو گے ۔ تم ہماری بے جان لاش پاس کھڑے ہو گے ۔ تم پوچھو گے اور
ہم کچھ نہ بولیں گے ۔ تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے ۔ اے میرے
پیارے رونے والے تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو
گے ۔ آہ ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤ گے ۔ اپنی ماں
کا محبت بھرا چہرہ اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے ۔ آہ ہم کو یہی رنج
ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہو گے ۔ سورہ میرے بچے سورہ،
سورہ میرے بالے سورہ ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں
کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو
شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں
میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی ۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کے آتشِ محبّت
کو بھڑکانے کے قابل ہوا ۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا ۔ رات کو اپنی
ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا ۔ اور جب کہ
وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ
صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے

بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا۔ تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں ۔ اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں ۔ آہ ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو وہ بڈھا[1] آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی ۔ لہو بھرا، دانتوں پھٹا کرتا دیکھتا ہے پر ملنے سے نا امید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے۔ غم سے زار نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھو وہ بے گناہ قیدی[2] اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار، غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھوں میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس کا گھرا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا

---

[1] مراد حضرت یعقوب علیہ السلام۔

[2] مراد حضرت یوسف علیہ السلام۔

ساتھی نہیں ہے۔ مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے۔ اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوتِ بازو اور اے بہادری کی ماں تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں، بے گانوں سے ملتا

ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انھیں کو دشمن پاتا ہے شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتوؤں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سیّد تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کر محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں۔ پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے تو ہی ہمارے دل کی تسلّی ہے تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچیں گے۔ تیری ہی سبب گوہر مراد کو پاویں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "امید"، تو ہمیشہ ہماری دل کی تسلّی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید، جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے۔ منھ پر مردنی چھاتی ہے۔ ہوا ہوائیں۔ پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی

آسان ہوتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے مگر ان سب چیزوں کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کی موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف

کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلیف آنے والے زمانہ
کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی
خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے ؎

بقدر[1] ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

---

[1] جس قدر ٹھہراؤ ہو اسی قدر آرام ملتا ہے۔ بھاگنے کے مقابلہ میں چلنے میں۔ کھڑے ہونے کے مقابلہ میں بیٹھنے میں اور سونے کے مقابلہ میں موت میں۔

# سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں
سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان
کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح
ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس
کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا
ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے۔
اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں سب
میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الاسب
کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز
کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور
کسی چیز کو برا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بری چیز کی حالت
کو ایسی حالت سے تبدیل کرلے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن
کی جڑ ہے جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اِسی

تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے، اچھا اور برا۔ اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور برا قرار دینے کے مختلف اسباب خَلقی اور خُلقی۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور برا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے، دوسری قوم اسی بات کو بہت برا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں، ان کی حاجتیں۔ ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں۔ ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہو گی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ

کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر اور خیال اور دماغ سے ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور برا ٹھہرتا ہے۔ اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور برے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور برے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا۔ یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں۔ جیسے کہ مزا یا مذاق۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے۔ بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر اور علم طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی ایک وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے

سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہو یا مادّی، یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے آسایش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے، چاندی، مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرّد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ نابیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ نابیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونسے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈہ زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے، عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے

دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اینچ، ہاتھوں کا بھاؤ اور پیر کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال، راگ اور راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر ان کی لَے اور دل کی پھڑک ان کا تال ہے۔ ان کا غول باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن خنیاگری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح ان کا تعلق عقلی اور مادّی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یعنی ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور

معاملات اور معاشرت اور طریق تمدّن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا۔ اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار خود اپنی عزّت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل کرنے کے بقول مسٹر ایچ، ٹی، بکل صاحب چار اصول ہیں:

اوّل: "جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کے علوم کو پھیلانا۔ پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسانوں کی ترقی ہوگی۔"

دوم: "اس تحقیقات سے پہلے تجسّس کا خیال پیدا ہونا چاہئے جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اس کی اعانت ہوتی ہے۔"

سوم: "جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم۔ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔"

چہارم: اس تحریک کا بڑا دشمن جو درحقیقت سولزیشن

کا بھی سخت دشمن ہے۔ یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات
کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو تب تک انسان
کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے
کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور مذہب یہ سکھلا دے کہ کس بات پر
یقین کرنا چاہیئے"۔

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ
شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ہم کو بتا دے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیئے۔
انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر کہ ہندوستان
میں بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجیپٹ میں بھی ناشائستگی اور ناتہذیبی
ہے اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال
نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور
مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جب تک یہ خیال نہ
جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہیئے
اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہو گی نہ حشمت۔ نہ عزت
ہو گی نہ منزلت۔ اور نہ تہذیب ہو گی اور نہ شائستگی۔ مگر دوسرا جملہ جو مذہب
سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی مذہب بلاشبہ تہذیب
کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بیجا تعصبات اور مسائل
اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام
مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے جیسے کہ مذہب اسلام کی موجودہ

حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلا شبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہب غلط کے مانع قوی ہے۔ الا کہ سچا مذہب جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے وہ کبھی حارج ترقی انسان نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔ وَالسَّلَامُ[1] عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

---

[1] سلامتی اس شخص پر جس نے سیدھے راستہ کی پیروی کی۔

# اپنی مدد آپ

## خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جیسا کہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے۔ از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابدی ہے) کہ وہ اس قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہم وطن بھائیو! کیا تمھارا ایسی

حال ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کر ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے، یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے۔ قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے بلکہ خود اس کے چال چلن پر، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قویٰ کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہو جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے۔ اور وہ فرض جان اور مال اور

آزادی کی حفاظت ہے۔ جب کہ قانون کا عملدر آمد دانش مندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی فضول خرچ کو کفایت شعار۔ شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے۔

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلوکِھِم"[1] اگر اس مقولہ میں "الناس" سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے۔ اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے۔ اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی

---

[1] رعایا اپنے بادشاہ کے طریقے پر ہوتی ہے۔

میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لائی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آجاتا ہے۔ اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن۔ اخلاق و عادات تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیوں کہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی۔ شخصی بے ایمانی، شخصی خودغرضی۔

کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمھاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح عمدہ ہو تا کہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا۔ وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا شغل اشغال کا تمھاری اولاد کے لئے ہے اس سے ان کی شخصی چال چلن۔ اخلاق و عادات۔ نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے، حاشا و کلا۔

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے۔ جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی۔ خود غرضی۔ جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں

جو اس طرح دل میں غلام ہیں۔ وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوسِ خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی۔ سچی عزت۔ اصلی ترقی شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن اور قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مِل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے۔ پھر اس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔" اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اور اس لئے اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا

ہوں ۔ اے مسلمان بھائیو! کیا تمھاری یہی حالت نہیں ہے ۔ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے ؟ تمھاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے ؟ ہیچ ہیچ ہیچ ! اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے ۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے ۔ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جائے اور ہم خود نہ کریں ۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے ۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے ۔ کیا لالہ اشرفی لال جوہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں انسانوں میں بہ کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں ؟

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے ۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے ۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں ۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو ۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط

خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آیرلنڈ کا تھا۔

اس نے کہا کہ "جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام وخوشی و آزادی کی ہو جاوے گی۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں۔ کانوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ مخفی باتوں کو ڈھونڈ نکالنے والوں۔ آلات جرِ ثقیل سے کام لینے والوں۔ اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں۔ شاعروں۔ حکیموں فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان

عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی۔ اور وہ جائداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مارِ سر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں۔ اور ترقی یافتہ حالت میں آیندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرادیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدانِ کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر انھیں محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب

ہوئی ہیں۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے و مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے کام کا جس کو انگریزی میں "لائف ایجوکیشن" کہتے ہیں۔ انسان پر۔ قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں الماری میں یا کسی بڑے مکتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا

ہے۔ مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں۔ گھر کے رہنے سہنے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں۔ صرافہ کی دوکان کرنے میں۔ ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے اور پھر بے سکھانے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل۔ چال چلن۔ تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔ قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے۔ اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عافیت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابلِ ادب بناتا ہے۔

کیا یہی وجہ ہے جو مدرستہ العلوم مسلمانان کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علیحدہ مدرستہ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؟

---

# سمجھ

## یعنی تمیز جس سے بھلائی برائی میں امتیاز کیا جاتا ہے

میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر ان کا حال دیکھا جاوے تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلے گا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بیہودہ خیالات آتے ہیں بیشمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دانا آدمی ان میں سے انتخاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کون سے خیالات ایسے ہیں جن کو گفتگو میں لانا چاہیئے اور کون سے ایسے ہیں جن کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ نادان آدمی ایسا نہیں کرتا اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہے بے سوچے سمجھے منہ سے بکتا جاتا ہے۔ دانش مند آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کی مانند ہوتا ہے جو اس کے دل میں آتا ہے بے تردّد دوست سے کہتا ہے گویا اس کے خیالات ہی ایک بلند آواز میں آتے ہیں۔

لیٹلی صاحب کا یہ قول ہے کہ انسان کو دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ

کرنا چاہیئے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔"
اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ نہایت عمدہ ہے مگر
پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ
کی کچھ بھی بات نہیں ہے بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی
کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات
نہیں کہہ سکتا۔ سچ ہے بعضی دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست بھید
کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انہی کو دغاباز اور برا کہتی ہے اور دوست پر بھروسا
کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی ہاں البتہ دوستوں کو منتخب کرنے میں بڑی
سمجھ چاہیئے۔

سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی
متعلق ہے اور گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما اور
ہمارے لئے ہمارے قادر مطلق خدا کی نائب ہے۔ انسان میں بہت سی بڑی
بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں مگر سمجھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ سمجھ ہی کے
سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ تمام
صفتیں اپنے اپنے موقع پر کام آتی ہیں۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں
وہ صفتیں ہیں ان صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سمجھ بغیر علم اور عقل دونوں
ناچیز ہیں۔ بھلائی برائی دکھائی دیتی ہے۔ باوجودیکہ انسان میں نہایت
عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں مگر سمجھ بغیر ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے اور
نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ سمجھ ہونے سے صرف انہی خوبیوں کا جو اس

یں ہیں مالک نہیں ہوتا بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں ان کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ سمجھ دار آدمی سے بھی گفتگو کرتا ہے اس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہے اور اس کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ ہر ایک مجلس میں نہ کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہے اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہے جس کو سمجھ ہے اور جو اہل مجلس کی لیاقتوں اور جو بات کہنی ہے اور جو نہ کہنی ہے اس میں تمیز کر سکتا ہے۔ جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو پر سمجھ نہ ہو وہ ایک نہایت قوی اور زبردست پر اندھے کی مانند ہے جو بسبب اپنے اندھے پن کے اپنے زور د قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہے۔ گو ایسے شخص کو دنیا میں اور سب طرح کے کمال حاصل ہوں مگر سمجھ نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے اگر اس کی سمجھ پوری ہو اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو اور باقی اوصاف متوسط درجہ کے رکھتا ہو تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔

سمجھ جس طرح کہ انسان کے لئے بہت بڑا کمال ہے اسی طرح مکر اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہے۔ نیک دل کی منتہائی خوبی سمجھ ہے اور بد دل کی منتہا بدی۔ مگر یا یوں کہو کہ وہ نیک دل کے لئے معراج ہے اور یہ بد دل کے لئے کمال۔ سمجھ نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے اور ان کے حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم کرتی ہے۔

مگر مکر میں صرف خود غرضی ہوتی ہے ۔ سمجھ مثل ایک روشن آنکھ کے ہے جس میں بے انتہا وسعت ہے اور تمام دنیا کو اور دور دور کی چیزوں کو، آسمانوں کو اور آسمانوں کے ستاروں کو بخوبی دیکھ سکتی ہے ۔ مکر مثل ایک کوتاہ نظر آنکھ کے ہے جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور دور کی چیزیں گو وہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں اسے نظر نہیں آتیں ۔ سمجھ جس قدر ہوتی ہے اسی قدر انسان کا اختیار اور اعتبار بڑھتا جاتا ہے ۔ مکر کاٹ کی ہنڈیا کی مانند ہے کہ جب ایک دفعہ کھل گیا تو پھر اس کی قوت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہے پھر انسان کسی کام کا نہیں رہتا جو کام کہ وہ ایسی حالت میں کر سکتا جب کہ لوگ اس کو ایک سیدھا سادھا بھولا بھالا آدمی سمجھتے ۔ اب وہ کام بھی وہ نہیں کر سکتا ۔ سمجھ عقل کے لئے کمال ہے اور ہمارے کاموں کے لئے رہنما ۔ مکر ایک قوت ہے جو صرف حال ہی کے فائدوں کو دیکھتی ہے ۔ سمجھ نہایت عقلمند اور نیک آدمیوں میں پائی جاتی ہے ۔ مکر اکثر جانوروں میں اور ان لوگوں میں جو جانوروں کی مانند یا ان سے کچھ بہتر ہوتے ہیں پایا جاتا ہے ۔ سمجھ نفس الامر میں ایک نہایت خوبصورت دلکش چیز ہے اور مکر گویا اس کی بگاڑی ہوئی نقل ہے ۔

سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں پر لگی رہتی ہے جو باتیں کہ زمانہ دراز کے بعد ہونے والی ہیں اور جو اب ہو رہی ہیں دونوں کو دیکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رنج و خوشی جو دوسری زندگی یعنی قیامت میں ہونے والی ہے وہ بے شک ہوگی ۔ گو اس کا زمانہ ابھی بہت دور ہے ۔ وہ اس کے دور ہونے کے سبب سے اس لئے اس کو حقیر نہیں سمجھتا کہ دوسری زندگی یعنی

قیامت کی تکلیف اور راحت لمحہ لمحہ پاس آتی جاتی ہے اور اسی طرح سے رنج وخوشی دیویں گی جیسے کہ زمانہ حال میں رنج وخوشی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت غور وفکر سے ان خوشیوں کے ہاتھ آنے کے لئے کوشش کرتا ہے جو قدرت نے اس کے لئے بنائی ہیں اور جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام تک دوڑاتا ہے اور اس کے حال ومآل کے نتیجوں پہ غور کرتا ہے اور اس فانی دنیا کے تھوڑے سے نفع اور فائدہ کو اگر در حقیقت وہ نفع اور فائدہ اس کی سچی عاقبت کے خیال کے مخالف ہو چھوڑ دیتا ہے۔ غرضکہ اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں۔ اس کا رویہ ایسے شخص کی مانند ہوتا ہے جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا مناسب طریقہ بھی جانتا ہے۔ سمجھ جس کو میں نے اس مضمون میں بطور ایک نیکی اور کمال کے بیان کیا ہے وہ صرف دنیا ہی کے کاموں کے لئے مفید نہیں بلکہ ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے بھی فائدہ مند ہے وہ صرف اس فانی انسان کے لئے ہی رہنما نہیں ہے بلکہ اس اصلی نافانی انسان کے لئے بھی جو ہم میں بولتا ہے رہنما ہے بعض مصنف اسی کو عقل کہتے ہیں اور بعض سمجھ یعنی تمیز جس سے اچھی وبری اور بھلائی وبرائی میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہی چیز سب سے بڑی ہے۔ اس کے فائدے بے انتہا ہیں اور پھر اس کا ہاتھ آنا نہایت ہی آسان ہے۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ سمجھ ہی ایسی رونق کی چیز ہے جس کو کبھی زوال نہیں جو اس کو چاہتے ہیں آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ جو اس کو ڈھونڈتے

ہیں وہ آسانی سے پاتے ہیں ۔ اس کی تلاش میں ان کو بہت دور جانا نہیں پڑتا کیوں کہ وہ اس کو اپنے ہی دروازہ پر پاتے ہیں ۔ اس کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال حاصل کرنا ہے ۔ جو کوئی اس پر خیال رکھتا ہے اسی دم جستجو سے چھوٹ جاتا ہے ۔ کیوں کہ وہ خود ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے اور جو اس کے لائق ہیں ان کو رستہ ہی میں ملتی ہے اور پھر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔
افسوس کہ ہماری قوم میں سب کچھ ہے پر یہی نہیں ۔

---

# اختتام سال ۱۲۹۱ھ و شروع سال ۱۲۹۲ھ

سوا چار برس بخیریت گذر گئے۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہو لیئے۔ اب دم باقی رہ گئی ہے۔ چاند کی بڑھیا کی کہانی کہ ہاتھی نکل گیا دم باقی ہے۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصلِ بہار کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے۔ جو کچھ کہ اس سوا چار برس میں ہوا۔ کیا ایسے قلیل زمانہ میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی۔ توبہ توبہ۔ کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بےخبر سو رہی تھی توقع تھی۔ استغفراللہ۔

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۰ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ ہجری جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا۔ امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جائے گا۔ ہماری قوم کی جو کچھ بداقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی داروئے بےہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا۔ دل پتھر ہو گئے تھے۔

دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے پر مردوں سے بدتر تھے۔ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔ لبوں پر جان ہے پھر اگر جان نہیں تو جہاں نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں۔ کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ جب پھر جھنجھوڑو تو ہاں اچھا کہہ کر دوسری طرف کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آ کر کمبل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے، تمھارا کیا اجارہ ہے۔ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو۔ مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے۔ ہم اسی بات کو سُن کر خوش ہوتے ہیں اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے۔ وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھدار بھی ہو جائیں گے۔ یہی رستخیز ہماری قوم کی اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی۔ اب کسی نہ کسی طرف بہہ نکلے گا۔ لوہا

پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی کے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیئے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنالے گا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے ؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ کیچڑ کہتے ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ (معاف کیجئے ان ضدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب تہذیب، سولزیشن سولزیشن، قومی ہمدردی قومی ہمدردی، پیٹریاٹزم پیٹریاٹزم کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اٹھاؤ، ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو۔ جس گلی کوچہ میں جاؤ سر سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سُن لو۔ مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ، مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ برا کہو یا بھلا کہو مگر ہم دعا گوؤں کو مت بھولو ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ کسی کی کیا رائے اور کسی کی کیا۔ کیوں کہ جو بات ٹھیک نہیں ہے وہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں سب

کو معلوم ہو جاوے گی اور سب اسی پر یقین کریں گے اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن وہ آوے گا جو قوم کہے گی کہ ہاں سید بھی کوئی دیوانہ تھا۔ یہ بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا اور اس کی مراد پوری ہو گئی والحمد للہ علیٰ ذالکؐ۔

مگر ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سویلائزڈ یعنی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھُلی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیئے۔ دوسرے کی آنکھ پھُلی ہو یا نہ ہو۔ باایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جب قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات کو ہم بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت

ؐ اس پر اللہ کا شکر ہے۔

ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرفداری کرتے ہیں اور ان کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت وہی لوگ محبِ وطن و محبِّ قوم ہیں۔ وذلک[1] فضل اللہ یوتیہ من یشاءُ

---

[1] یہ خدا کی عنایت ہے جس کو چاہے عطا کرے۔

# آخری پرچہ

## تہذیبُ الاخلاق

سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں تاکہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا۔ اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے اور کچھ جھنجھلائے۔ اِدھر ہاتھ جھٹک دیا۔ اُدھر پیر پٹک دیا اور جھنجھلاہٹ میں اینڈے پڑے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے اور تہذیب الاخلاق کو بند کر کر دور سے نیند کے ان خمار آلودوں کا جواب صرف جھنجھلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں اٹھنا اور ہوشیار ہونا دیکھنا چاہیے۔ بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے۔ تم چپ ہو رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو۔ پی لو۔ پی لو۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے

کہ میں اپنے کو ناصح مشفق سمجھتا ہوں بلکہ جو ہرٹ اور جو حالت ہماری قوم کی ہے اس کو جتلانا چاہتا ہوں۔

ایک دن تھا کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے ؎

لو آج میسر مسجدِ جامع کے ہیں امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے۔ اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔ جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔ تم کو کس نے جگایا ہ دل اور زمانہ نے۔ دل کی گھڑت ایسی تھی جس میں ہمیشہ غمخواری تھی۔ پر سوتا تھا۔ زمانہ نے جھٹکا دیا اور جگا دیا۔ دفعتاً دیکھا کہ دنیا الٹ گئی اور رنگ برنگ کی کھلواڑی سب اجڑ گئی۔ قوم کی حالت وہ دیکھی کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائے۔ اس بربادی کے سبب کا غیر قوم کو تو اور ہی خیال ہوا پر غلط ہوا اور مجھ کو جو ہوا وہ خود اپنی قوم کی حالت کا ابتر ہونا تھا۔ قوم کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر ادھر کی چیزیں تو درکنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا پتھر نہ تھا جو نہ پگلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا۔ ایک مدت

تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے۔ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ جتنی امید کرتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ تو نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے۔ مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا جو اب ظاہر ہے۔ کافر، مرتد۔ ملحد۔ زندیق۔ اسلام کا دشمن مسلمانوں کا ہاجی۔ قوم کا عیب جو۔ دین دنیا سے آزاد کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا اور ہم پر اس مثل کا صادق آنا کہ "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا"، مگر شکر ہے کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا اور ہمیشہ ہمارے دل میں یہی آیا کہ اے خدا ان پر رحم کر کیوں کہ وہ نہیں جانتے۔

انھی قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بد بو زیادہ پھیلے گی مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی۔ پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا۔ اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا۔ مگر خدا سے آرزو ہے کہ اگر ہم نے وہ نہیں کیا جو ہم کو نا تھا تو وہ وہی کرے جو اس کو کرنا ہے ؎

از بندہ خضوع و التجامے زیبد　　بخشایشِ بندہ از خدامے زیبد

گر من کنم آنکہ آں مرا ناز یباست ۔ توکن ہمہ آنکہ آں ترا مے زیبد[1]

سات برس تک ہم نے ذریعہ اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بیجا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام پر نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں ان کو ہٹایا اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا چمکایا۔ اردو زبان کا علم ادب جو بد خیالات اور موٹے و بھدے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا ہے۔ اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی۔ قومی عزت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سُنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں گو اس وقت ٹھہری ٹھہری لہریں کھاتے ہیں مگر پانی میں حرکت

---

[1] اے بندے کے لئے عاجزی اور انکساری مناسب ہے اور بندوں کو بخشنا تیری شان ہے۔ اگر میں ایسے کام کرتا ہوں جو مجھے نہیں کرنا چاہئیں تو تو وہ کر جو تیرے لئے مناسب ہے۔ (یعنی بندہ اگر گناہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے تو تیری شان بدلہ لینا نہیں ہے بلکہ معاف کر دینا ہے۔)

کا آجانا کافی ہے۔ وہ پھر خود اپنی پنسال میں آپ چورس ہو رہے گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ اب ہم بس کریں اور پانی کو آپ ہی آپ چورس ہونے دیں۔

ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دور از کار نہ خیال کریں گے اور نہ اس پر التفات کریں گے جو ہمارے ناصح نور الآفاق نے اپنے اخیر پرچہ میں لکھا تھا بلکہ یہ خیال کریں گے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں مصروف ہوں گے جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا نَنسَخْ[1] مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں اور اب اس پرچہ کو ان سے رخصت کرتے ہیں اور وہ دن بھی اب آنے والا ہے کہ ہم خود ہی ان سے رخصت ہوں گے۔

ہم نے اپنے اس ارادہ سے اپنے بعض دوستوں کو مطلع کیا تھا اور جب ان کو معلوم ہو گیا کہ ہم نے یہ ارادہ مصمم کر لیا ہے تو انھوں نے ہمارے ان سات برس کے پرچوں کے ریویو لکھے ہیں جن کو ہم نہایت احسان مندی و شکر گذاری سے اس اپنے اخیر پرچہ میں درج کرتے ہیں۔ والسلام

---

[1] ہم کسی آیت کو نہ منسوخ کرتے ہیں اور نہ فراموش کرتے ہیں۔ جب تک اس سے بہتر یا اس جیسی چیز فراہم نہ کر دیں۔

# درسی مطبوعات

نقوش ادب (حصہ نثر و نظم) — مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی — ۴/۵۰

خیابان ادب (حصہ نثر) — مرتبہ عظیم الحق جنیدی — ۳/۷۵

خیابان ادب (حصہ نظم) — ” — ۳/۷۵

ابتدائی اردو نصاب (حصہ نثر و نظم) — مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی — ۲/۵۰

نیا ادبی نصاب (حصہ نثر و نظم) — مرتبہ اطہر پرویز و عظیم الحق جنیدی — ۴/۵۰

انتخاب نو (حصہ نثر و نظم) حصہ اول — مرتبہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی — ۲/۰۰

انتخاب نو (حصہ نثر و نظم) حصہ دوم — ” — ۳/۵۰

منتخبات نظم — مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی — ۱/۰۰

نصاب فارسی — ڈاکٹر غلام سرور — ۳/۰۰

سخنِ نو (حصہ اول) — ” — ۱/۹۰

” (حصہ دوم) — ” — ۲/۲۵

” (حصہ سوم) — ” — ۲/۷۵

گلہائے بہار — ” — ۲/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱